مقدمہ

سید سکندر مہدی

نئی دنیاؤں کا حصول دریافت کا حقیقی عمل نہیں ہے حقیقی عمل یہ ہے کہ دنیا کو
نئے زاویے سے دیکھا جائے۔

(مارسل پراؤسٹ)

خونریزیاں جاری ہیں۔ گوکہ ریاستوں کے درمیان موت، تباہی اور بربادی پھیلانے والی جنگوں کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے لیکن ریاستوں کے اندر قتل و غارت گری اور خونریزی میں کمی کے آثار نظر نہیں آتے۔ دنیا کے کئی حصوں میں انسانی قتل کا سلسلہ جاری ہے جس کی خبریں بین الاقوامی میڈیا میں صرف کبھی کبھی شائع ہوتی ہیں۔ حکومتوں، مزاحمتی فوجوں کے جوابی حملوں، جنگجو سرداروں اور ان کی ذاتی فوجوں کے درمیان تصادم، گہری فرقہ وارانہ اور نسلی نفرت اور خودکش حملوں کی وجہ سے بین الاقوامی یا غیر بین الاقوامی سطحوں پر قتل عام ہو رہا ہے۔ اس خونریز دور میں پروفیسر گلین پیج ایک ہلاکت گریز عالمی سماج کی وکالت کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔

یہ مقالہ دو اہم حصوں پر مشتمل ہے اور اس میں پیج کی جانب سے اٹھائے گئے مسئلے کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلا حصہ انسانی تاریخ میں ہونے والے انسانی قتل سے ہے جبکہ دوسرے حصے میں پیج کے دلائل کی روشنی میں ایک ہلاکت گریز سماج کے امکانات پر بحث کی گئی ہے۔ ایسے سماج کی حمایت میں یہ دلائل پیج نے اپنے انتہائی متنازع، اشتعال انگیز اور تخلیقی مطالعے بعنوان ہلاکت گریز عالمی علمِ سیاسیات میں پیش کئے ہیں۔ (1) اس مقالے میں عصر حاضر کے

قاتلانہ خدوخال پر بحث کا آغاز امن، ہلاکت گریزی اور انسان دوستی کی ان توقعات کے حوالے سے ہوتا ہے جو بعد از سرد جنگ دور میں ابھری ہیں۔ 1989ء کے بعد کے عرصے میں ان امیدوں اور توقعات کے قتل کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بعد از 1989 امیدیں اور ان کا خاتمہ

آج سے ڈیڑھ دہائی پہلے تک دنیا میں امن کی خوبصورت امیدیں عروج پر تھیں۔ 1989 کا سال اپنے ساتھ تبدیلیاں لایا۔ اس نے سرد جنگ کے دور کی تقسیم کے غیر لچکدار عقائد اور قوانین کے ڈھانچوں کو توڑ دیا اور بڑی جرات سے سلامتی ترقی اور ریاست اور شہریوں کے درمیان تعلق کے پرانے اور روایتی تصور کو چیلنج کیا۔ سرد جنگ اپنے انجام کو پہنچ رہی تھی۔ دنیا میں یہ امید پروان چڑھ رہی تھی کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد غیر معمولی قتل و غارت کا دور بھی ختم ہو جائے گا اور انسانی تاریخ کی یہ سب سے خوں آشام صدی تاریخ کی کتابوں اور انسانی حافظے میں دفن ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ، دنیا میں یہ امید بھی پیدا ہوئی ہر جگہ جمہوریت اور لبرل ازم کا دور دورہ ہوگا۔ حکومتیں، اپنے شہریوں اور ان کی زندگی کے حق فلاح و بہبود، خوشیوں اور مسرتوں کا احترام کریں گی۔ امن کے پرجوش حامیوں نے امن، محبت اور وسائل میں اشتراک، رواداری اور انسانی دوستی پر مبنی ایک عالمی نظام کا تقریباً اعلان کر دیا تھا۔

لیکن پھر 1989ء کا سال آ گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ 1990 کی دہائی کے آغاز سے اہم تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ دنیا اس نیو ٹونین Newtonian دور سے باہر نکلنے لگی جب انسانوں نے اپنے درمیان بہت سے پل نہیں دیواریں تعمیر کی تھیں۔ (2) پوری دنیا بالخصوص یورپ میں تعمیر دیواروں جن میں دیوار برلن بھی شامل تھی اور کئی دوسری نظریاتی، سیاسی، فوجی اور معاشی دیواروں کو گرا دیا گیا اور ان کی جگہ متعدد پل تعمیر ہوئے۔ سرد جنگ کے اختتام کے ساتھ عالمی نیوکلیائی تباہی (holocaust) کا خوف کم ہوا اور انسانی نسل کی بقا کی امیدیں روشن ہوئیں۔ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا، قتل کرنے اور جلد قتل ہو جانے پر تیار غیر ملکی اور قومی افواج اپنے ملکوں اور بیرکوں کی طرف لوٹنا شروع ہوئیں جو اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ اب ان کے درمیان جنگیں نہیں ہوں گی اور بڑے پیمانے پر انسانی قتل

کا خطرہ معدوم ہو جائے گا۔ مشرقی یورپ، لاطینی امریکہ، ایشیا اور افریقہ میں جمہوری قوتیں مزید توانا ہو گئیں جس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ مستقبل میں، ریاستوں کے اندر اور ان کے درمیان سیاست کا مرکز طاقت نہیں بلکہ عوام ہوں گے اور حیات نو پانے والی اقوام متحدہ کے ذریعے، ریاستوں کے درمیان قانون کی حکمرانی اور برابری کے اصولوں کے تحت رشتے قائم ہوں گے۔

مزید براں، مشرق اور مغرب کے درمیان تنازعے کے خاتمے، نیوکلیائی جنگ کے خطرات میں کمی، یورپ میں سیاسی اور معاشی لبرل ازم کی فتح، ہر جگہ انسان ترقی کی کوششوں پر خصوصی توجہ، عسکر کاری پر اہمیت میں کمی جیسے واقعات نے خطرات سے دوچار، کرہ ارض کے شہریوں کے لیے جامع انسانی سلامتی کو یقینی بنایا۔ بہت سے علاقوں میں کشیدگی کی آگ دوبارہ سرد ہوئی۔ ایران اور عراق کے درمیان خونی جنگ کا خاتمہ ہوا۔ 1988ء میں، افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی نے اس ملک کے لیے ایک پُر امن مستقبل کی نوید دی۔ کمبوڈیا میں حالات کچھ حد تک بہتر ہوئے اور اس کے ساتھ ہارن آف افریقہ میں طویل خانہ جنگیوں (بالخصوص ایتھوپیا میں اریٹریا اور ٹائیگرے کی آزادی سے) کا زور کم ہوا۔ جرمنی دوبارہ متحد ہوا اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت اور فلسطینیوں کے سیلف رول جیسے عدم استحکام کا باعث دیرینہ مسائل 1993ء میں فیصلہ کن حل کے مرحلے میں داخل ہو گئے۔ آئرلینڈ میں بغاوت کا خاتمہ بھی اسی اہمیت کا حامل ہے جس کے نتیجے میں کئی دہائیوں سے جاری فرقہ وارانہ تشدد ختم ہوا۔ پوری دنیا میں، تنازعات کو جنگوں کے ذریعے نہیں بلکہ پائیدار مذاکرات اور دیگر پر امن ذرائع سے حل کرنے کی فوری ضرورت کو تسلیم کیا گیا۔ قصہ مختصر، ہر جگہ محروم اور پس ماندہ لوگوں کے حقوق، آزادیوں، امن، ترقی اور انسانی سلامتی کی روشن اور درخشاں تحریک، خیرہ کر دینے والے انسانی تخیل اور ایک زیادہ انسان صفت اور مہرباں عالمی نظام کی امیدوں کے گرد رقصاں تھی۔

بہر حال، یہ خواب بہت جلد بکھر گئے۔ یکے بعد دیگرے تیزی سے ظہور پذیر ہونے والے واقعات نے تیزی سے ابھرنے والے فریب نظر خود فریبوں کا پردہ چاک کر دیا۔ 1989 کے صرف چار سال بعد 1993ء میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سیکریٹری جنرل پیری سین (Pierre Sane) نے انسانی حقوق کے عالمی دن پر تصویر کے تاریک رخ کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا:

چار سال پہلے جب دیوار برلن، لڑکھڑاتی ہوئی نیچے گری تھی تو ہمیں ایک نئے اور روشن مستقبل کی نوید ملی تھی۔ نئی جواب دہ حکومتوں، نئی خوشحالی، دنیا کی حکومتوں کے درمیان نئے تعاون کی نوید۔ لیکن اب ہم ہمارے سامنے کیا منظر ہے؟ جواب دہ جمہوریتوں کی بجائے ہم ہولناک خانہ جنگیوں اور حکومتوں کو جبر کے پرانے طریقوں پر عمل کرتے دیکھ رہے ہیں۔ خوش حالی تو دور کی بات ہے، ہم آج پہلے سے کہیں زیادہ انسانوں کو غربت، بیماری اور اذیت کے جہنم میں جلتے دیکھ رہے ہیں۔ بین الاقوامی تعاون کی بجائے ہم عالمی برادری کو انسانی حقوق کی تباہیوں کے سامنے لڑکھڑاتا دیکھ رہے ہیں۔(3)

ایک سال بعد، 1994ء میں، رابرٹ کیپلان نے اپنے ایک کشف یا الہامی مضمون میں تاریک مستقبل کی تصویر کشی کی تھی۔ یہ مضمون ایٹلانٹک منتھلی میں شائع ہوا تھا۔ جس میں کیپلان نے لکھا تھا:

دنیا بھر میں آبادیات، ماحولیات اور معاشرتی دباؤ کی بناء پر مجرمانہ انارکی ایک اہم حقیقی خطرہ بن کر ابھری ہے۔ بیماری، آبادی میں اضافہ، بلا اشتعال جرم، وسائل کی کمیابی، پناہ گزینوں کا ترک وطن، قوم کی افزوں فرسودگی۔ ریاستیں اور بین الاقوامی سرحدیں، نجی فوجوں، سیکورٹی فرموں، منشیات کے بین الاقوامی کارٹیل کی طاقت اور اختیار، ان مسائل کا مناسب تعارف ہیں جن کا سامنا ہماری تہذیب کو بہت جلد کرنا پڑے گا۔(4)

کیپلان نے جس آنے والی انارکی کا ذکر کیا تھا، اس کے مقابلے میں آج دنیا زیادہ نراجی اور خوں ریز ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر، 1989 سے 1998 کے درمیان 107 خانہ جنگیاں ہو چکی ہیں جنہیں uncivil war کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاستوں کے درمیان صرف سات جنگیں ہوئیں۔ 1988 کے آغاز میں ایک سرحد پار جنگ کے مقابلے میں 32 خانہ جنگیاں ہو رہی تھیں جدول 1 میں 1816 سے 1998 کے درمیان ہونے والی 231 خانہ جنگیوں کی شرح اعادہ اور شدت دکھائی گئی ہے جس سے واضح طور پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ 1989 کے بعد بڑی تیزی سے بہت زیادہ خانہ جنگیاں ہوئی ہیں۔

جدول 1: بیسویں صدی کے ڈیموسائڈ (000)[a]

حکومتیں	سال	کل تعداد	داخلی	نسل کشی
بڑے قاتل	1900-1987	151,491	116,380	33,476
10,000,000 اور زیادہ	1900-1987	128,168	100,842	26,690
یو ایس ایس آر	1917-1987	61,991	54,769	10,000
چین (پی آر سی)	1949-1987	35,236	35,236	375
جرمنی	1933-1945	20,946	762	16,315
چین (کے ایم ٹی)	1928-1949	10,075	10,075	Nil
کمتر بڑے قاتل 10,000,00 سے کم	1900-1987	19,178	12,237	6184
جاپان	1936-1945	5,964	Nil	Nil
چین (ماؤ سوویت)[b]	1923-1949	3,466	3,466	Nil
کمبوڈیا	1975-1979	2,035	2,000	541
ترکی	1909-1918	1,883	1,752	1,833
ویت نام	1945-1987	1,678	944	Nil
پولینڈ	1945-1948	1,585	1,585	1,585
پاکستان	1958-1987	1,503	1,503	1,500
یوگوسلاویہ (ٹیٹو)	1944-1987	1,072	987	675
مشتبہ بڑے قاتل	1900-1987	4,145	3,301	602
شمالی کوریا	1948-1987	1,663	1,293	Nil
میکسیکو	1900-1920	1,417	1,417	100
روس	1900-1917	1,066	591	502

4,071	10,812	14,918	1900-1987	کمتر قاتل 100,000 تا 999,999
1,078	2,192	4,074	1900-1987	پانچ سب سے بڑے کمتر قاتل (چین[وارلارڈز]ترکی[اتاترک]یو۔کے۔پرتگال[ڈکٹیٹر شپ] انڈونیشیا)
1,019	2,335	2,792	1900-1987	کمتر قاتل(100,000 سے کم)
38,556	129,547	169,202	1900-1987	کل عالمی تعداد

Source: Adapted form Rummel 1994,

Allan D.Grimshaw,"Genocide and Democide" Lerster Kurtz et.al.(eds).*Encylopedia of Violence, peace, Conflict,* 3 vols., vol.2, New York: Academic press, 1999, P.60.

A)Includes genocide, politicide, and mass; excludes war dead. These are most probably midestimates in low to high ranges. Figures may not sum due to rounding.

جدول سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ جنوبی کرہ ارض کی ناکام ریاستیں بعداز 1989 دور میں میدان جنگ کے طور پر ابھریں۔ یہ کلیشے کہ ''انتہائی وحشیانہ تنازعات گھر میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔'' کنگلے اور ونکاف کے مشاہدے کے مطابق ''بدنما حقیقت کا آئینہ دار ہے، کیونکہ پورے علاقوں کو غیر آباد کرنے پر مرکوز نسل کشی اور قتل عام حالیہ خانہ جنگیوں میں عام ہو چکے ہیں''۔ان کا مزید کہنا تھا، ''یہ بھیانک حقیقت روانڈا میں وقوع پذیر ہوئی، جہاں ہوتو سرکار نے شہریوں کو نسل کش قتل عام پر اکسایا اور اس کے نتیجے میں ایک اندازے کے مطابق ایک ماہ کے دوران پانچ لاکھ لوگوں کو قتل کیا گیا''۔(5) یوگوسلاویہ کی ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں بوسنیا نژاد مسلمانوں کی نسلی

صفائی کی کوششیں، ہیبت ناک انسانی ہلاکت اور اجتماعی آبروریزی کی ایک اور مثال ہے جو 1990 کے عشرے میں وقوع پذیر ہوئی (6) اسی طرح، سوڈان، سری لنکا، افغانستان، ایل سلواڈور کی خانہ جنگیاں اور افغانستان اور عراق میں امریکی سربراہی میں فوجی مہم جوئی لاکھوں جنگجوؤں اور غیر جنگجوؤں کی ہلاکتوں اور لاکھوں افراد کی بے گھری کا سبب بن چکی ہے۔ قتل کرنے کے ان مشقوں میں سے بیشتر پر سائنسی اور وحشیانہ طور پر عمل درآمد کیا گیا۔

بیسویں صدی سے قبل قتلِ انسانی

یہاں، اس امر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے کہ منظم قتل عام صرف عصر حاضر کا کوئی نادر معاملہ یا خصوصیت نہیں ہے۔ یہ سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔ دنیا میں حکمرانی، علاقوں، وسائل اور لوگوں پر غلبے، مذہبی معرکوں اور غلبوں کے لئے اور تنوع اور ثقافتی کثرتِ وجود کو پنپنے نہ دینے کے لئے دنیا وحشیانہ قتل کا ایک طویل ریکارڈ رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر، عہد قدیم کے حکمرانوں نے جنگوں کے درمیان غیر ملکی شہریوں کا قتل عام کیا، قیدیوں پر تشدد کیا اور ان کے جسمانی اعضا کاٹ دیئے، خواہ وہ قیدی فوجی تھے یا شہری، اجتماعی آبروریزیاں کیں اور مفتوحہ علاقوں کو تاخت و تاراج اور تباہ و برباد کیا۔ اسی طرح، رومیوں نے کارتھیج شہر میں لوٹ مار کرنے کے بعد اسے تباہ کر دیا تھا اور محاصرے سے بچ جانے والے تمام افراد کو قتل کر دیا تھا۔ اور چودھویں اور پندرہویں صدیوں کے دوران مغلوں نے پورے ایشیا میں تسلسل سے تاراجی کرتے ہوئے تین کروڑ افراد کو قتل کیا۔ ان میں سے بیشتر کو دستی ہتھیاروں سے ایک ایک کر کے قتل کیا گیا۔ (7)

مغلوں نے جو کام غیر مہذب اور وحشیانہ طور پر کیا، وہی کام یورپی استعماریت پسندوں نے زیادہ نپے تلے، سائنسی اور عیارانہ طریقوں سے انجام دیا۔ امریکہ کے مقامی باشندوں کے قتل کو امریکی قتل عام قرار دینے والے، ڈیوڈ اسٹیزڈ کے مطابق، قبل از قتال عظیم، براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں زیادہ بڑی تھی۔ امریکہ کے ان قدیم باشندوں میں سے تقریباً 80 لاکھ افراد براہِ راست جنگ میں موت کا شکار ہوئے یا پھر جنگ اور تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اور دل شکستگی کے باعث موت سے ہم کنار ہوئے۔۔۔ یہ تمام لوگ کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے بعد 21 سال کے اندر مرے تھے۔ اسٹیزڈ

نے یہ تخمینہ ان اعداد و شمار سے قائم کیا کہ پندرہویں صدی کے اختتام پر کرہ ارض پر 10 کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد تقریباً 50 لاکھ رہ گئی تھی۔ انسانی قتل پر ایک اور مطالعہ میں جوآر۔ رومیل نے داخلی اور بین الاقوامی جنگوں میں حکومتی قتل کا شکار بننے والوں کی تعداد کی تین عشروں تک دستاویز تیار کرنے کے بعد مرتب کیا تھا، چار عدد قتل عام (Democides) کا اندازہ لگایا ہے جس میں بیسویں صدی سے قبل معلوم تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کئے گئے تھے۔ ان کا اندازہ ہے کہ چین میں 221 قبل مسیح اور 19 ویں صدی عیسوی کے اختتام کے درمیان تقریباً تین کروڑ 40 لاکھ افراد کو قتل کیا، گیا افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ 70 لاکھ افراد قتل ہوئے، اور یوروپی باشندوں کی آمد سے لے کر 19 ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ 40 لاکھ افراد کو قتل کیا گیا۔ اس طرح یہ چار قتل عام تقریباً 10 کروڑ افراد کے قتل کا باعث بن جاتے ہیں (9)

بہر حال، ہر کسوٹی یا شمار کے حساب سے بیسویں صدی خونریز ترین صدی بن چکی ہے۔ جدول -2 میں دیئے گئے 20 صدی کے قتل عام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واضح طور پر ایک Megamurder کی صدی تھی۔

جدول II: 231 خانہ جنگیوں کی فریکوئنسی اور شدت 1816-1998

مدت	بنیادی نظام خصوصیات	نظام کا حجم (ریاستوں کی اوسط تعداد)	شروع ہوئی خانہ جنگیوں کی تعداد	نظام کا حجم جنگ ہلاکتیں	وسیع پیمانے کی نوعی مداخلتوں کے ذریعے عالمگیر حیثیت حاصل کرنے والی خانہ جنگیوں کی تعداد (فیصد)
1816-1848	یورپ کی سنگت میں بادشاہتوں کے ذریعے کچلے گئے جمہوری انقلاب	28	12	93,200	3(25%)
1849-1881	ابھرتی ہوئی قوم پرستی اور خانہ جنگیاں	39	20	2,891,600	1(5%)

3(17%)	388,000	18	40	سامراجیت اور نوآبادیت	1882-1914
4(29%)	1,631,460	14	59	عالمی جنگیں اور معاشی درماندگی	1915-1945
14(23%)	6,222,020	60	117	سرد جنگ کے دوران ابھرتے ہوئے عالمی جنوب کے ممالک کا نوآبادیت سے چھٹکارا اور آزادی	1946-1988
10(9%)	1,950,000	107	192	ناکام ریاستوں اور خانہ جنگیوں کا عہد	1989-1998
33(14%)	13,216,000	231	192		مجموعی تعداد

Source: Chales W. Kegley, Jr, & Eugene R. Wittkopfe (eds), World Politics: Trend and Transformation, 8th ed., London: Macmillan press Ltd, 2001, P.436

رُتھ لیگر سیورڈ کے اندازے کے مطابق، 1910ء سے 1985ء کے دوران لڑی گئی 202 جنگوں میں تخمیناً 7 کروڑ 80 لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں، بیسویں صدی میں ہونے والی اموات انیسویں صدی کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ تھیں۔(10) صرف ان دو جنگوں میں، 100 سال سے کم عرصے کے دوران، اہم شریک ملکوں کے 60 کروڑ شہری قتل ہوئے۔ یہ تعداد کئی یوروپی ملکوں کی کل تعداد سے زیادہ ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں 80 لاکھ فوجی اور ایک لاکھ شہری ہلاک ہوئے جبکہ 1918 میں انفلوئنزا کی وباء پھیلنے سے ایک کروڑ اسی لاکھ آفراد ہلاک ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک سوویت یونین تھا جہاں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کل ہلاکتوں کا 40 فیصد تھی۔

بہرحال، 1945ء میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے سے مزید جنگوں کا راستہ بند نہیں ہوا۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر امن کے حوالے سے پر جوش امیدوں کے برعکس 1939 سے 1945 تک جاری رہنے والی یہ جنگ تمام جنگوں کو ختم کرنے کا باعث ثابت نہیں ہوسکی۔ آنے

والے برسوں میں نئی جنگیں پھوٹ پڑیں۔جن کے شعلے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دور دراز علاقوں تک پہنچے اور ان جنگوں کے نتیجے میں بے پناہ تباہی ہوئی اور انسانوں کو بھیانک عذاب جھیلنے پڑے۔ ہال کین نے 1995 میں لکھتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ ''ایک تجربے کے مطابق 1945ء کے بعد ہونے والی جنگوں میں ہلاکتوں کی تعداد انیسویں صدی سے دوگنی اور 18 ویں صدی سے سات گنا زیادہ تھی''۔(11)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ 1989 کے بعد سے بھی انسانی ہلاکتوں کا سلسلہ جاری ہے۔کچھ حوالوں سے یہ ایک زیادہ خونریز دور ہے۔ایسا اس وجہ سے ہے کہ uncivil wars کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ یہ جنگیں بھاری قیمت وصول کر رہی ہیں اور انسانوں کے عذاب میں بے پناہ اضافہ کر رہی ہیں۔مزید براں، دہشت گردی میں نمایاں اضافہ، عالمی اور علاقائی سطحوں پر مجرمانہ سیاسی اور معاشی سرگرمیوں میں تیزی، طاقت کے غرور میں چور امریکہ کا دنیا کی واحد عالمی طاقت کے طور پر ابھرنا، نسل پرستی اور نسلی تنازعات میں ابھار، انتہا پسندی اور مذہبی شدت پسندی میں پھیلاؤ، اقوام متحدہ کا تیزی سے بے اختیار ہونے کا عمل، اور حکومتوں کا اپنے شہریوں کو بلا روک ٹوک ہلاک کرنے والے جیسے تمام عوامل نے دنیا کے خطرے سے دوچار اور خوفزدہ شہریوں کی بے اختیاری اور زد پذیری میں اضافہ کر دیا ہے۔

ان لاکھوں انسانوں کو ان جیسے دوسرے ساتھی انسانوں سے کس طرح بچایا جا سکتا ہے جن کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں، جو ہمہ وقت سفاکی پر آمادہ رہتے ہیں اور جو بالخصوص ترقی پذیر سماجوں میں بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کا باعث بنتے ہیں؟ کیا قتل عام سے بچا جا سکتا ہے، اسے روکنا اور ختم کرنا ممکن ہے؟ کیا دنیا جنگوں سے آزاد ہو سکتی ہے؟ کیا کبھی ایک ہلاکت گریز عالمی سماج وجود میں آ سکتا ہے؟

جنگ کا بدنما چہرہ

''انسانی تخیل پر جنگ کی طاقت اور سحر انگیزی کی تاریخ پرانی ہے''۔(12) ٹھیک اس زمانے سے عصرِ حاضر تک کہ جب عہد قدیم میں جنگی سماجوں کا عروج تھا اور ٹیکنالوجی سے نابلد لوگ جو انسانوں کو بڑے اطمینان سے قتل کرتے تھے اور اس عمل سے لطف حاصل کرتے تھے،

جنگ کو عمومی طور پر مقدس، رومانوی حیثیت دی جاتی ہے اور اس کی مدح سرائی کی جاتی ہے۔ ہر چند کہ پچھلی چند صدیوں کے دوران بڑی تیزی سے بہت کچھ بدل چکا ہے لیکن ایک جنگجو کی نظر میں آج بھی جنگ "اعلیٰ ترین مہم جوئی، بے قراری کا یقینی توڑ، نہ ختم ہونے والے افسانوں، روایتوں، جنگی گیتوں" مذہبی اسطوروں اور مفاہیم کی ذاتی جستجو کی ناقابل اختتام تکرار کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگ ان ہی کیفیتوں کے لیے مرتے ہیں اور ان ہی کے لیے رہتے ہیں۔"(13) عام طور پر جنگ کا دوسرا رخ یعنی بدنما پہلو کی نقاب کشائی میں بہت کم دلچسپی موجود تھی (14) بہر حال، جنگ کا چھپا ہوا پہلو زیادہ عرصہ پوشیدہ نہیں رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی امن تحریک کے فروغ اور جنگ کی بدنمائی اور جنگی المیوں پر اسکالروں، امن کے پرچارکوں، امن کے تحقیقی اداروں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی اہم اور بصیرت افروز تصانیف نے خصوصی طور پر یورپ والوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور ایٹم بم پر پابندی لگانے اور جنگی اداروں کے خاتمے کی طاقت ور تحریکیں 1960ء کی آمد کے بعد سے دنیا بھر میں پھوٹ پڑیں۔ 1960ء میں بعد از وفات شائع ہونے والے لیوس رچرڈسن کے مطالعاتی بعنوان "اسلحہ اور عدم تحفظ، جنگ کی وجوہ اور نقطہ آغاز کا ریاضیاتی مطالعہ" اور "مہلک جھگڑے" اور کوئنسی رائٹ کی یادگار 1552 صفحات کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب بعنوان "جنگ کا ایک مطالعہ" جنگ میں انسانی ہلاکت اور عام لوگوں کے لئے جنگ سے لاتعلقی پر مرکوز تھی۔ آنے والے برسوں میں امن کے ثمرات جنگ کی دہشتناکیوں، نسل کشی اور نیوکلیائی تباہی، ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کے مخصوص مفادات، فوجی اور انڈسٹریل کمپلیکس اور ہتھیار فروخت کرنے والے اداروں اور جنگی کلچر کو فروغ دینے والوں کے بارے میں سلامتی کی ایک نئی سوچ کی حوصلہ افزائی، ترقی اور لوگوں پر بہت سے مطالعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔(15) کئی برسوں کے دوران امن کی طاقت ور تحریکوں نے تنازعات کے پُر امن ذرائع سے حل اور آزادی اور انسانی حقوق کے لئے زور پکڑا ہے۔ ان معاملات نے یورپی اور شمالی امریکی ریاستوں میں بالخصوص پالیسیوں میں نمایاں تبدیلی لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ تمام جنگوں کو ناقابل جواز سمجھنے کے تصور کو فروغ ملا ہے اور جنگ ایک ادارے کے طور پر ترقی یافتہ دنیا میں تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب متعدد ترقی پذیر سماجوں میں انسانوں کا بلا روک ٹوک قتل عام کیا جا رہا تھا۔ لیکن کیا انسانوں کو ہلاک کرنے کی اس روایت اور عمل کو ترک نہیں کیا جا سکتا؟ کیا

حکومتیں خود اپنے لوگوں اور دوسروں کو قتل کرنا بند نہیں کر سکتیں؟ کیا انسانوں کے قتل پر قابو پانا ممکن نہیں ہے؟ اگر ماضی میں اس پر قابو نہیں پایا جا سکا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آج بھی اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا؟ کیا ہمیں ایک ہلاکت گریز عالمی سماج کے لئے کام نہیں کرنا چاہئے؟ کیا ایک ہلاکت گریز عالمی سماج ممکن ہے؟

اگر انسانوں کی جانب سے ساتھی انسانوں پر تشدد کے حوالے سے تاریخ کے ریکارڈ کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو مذکورہ بالا سوالات کا صرف ایک جواب نظر آتا ہے اور وہ ہے، بہت بڑا ''نہیں'' ایک زوردار 'نہیں' اور ایک ایسا ''نہیں'' جس پر کوئی مکالمہ ممکن نہیں۔ لیکن گلین پیج اپنے روایت شکن مکالمے میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام ممکن ہے وہ اپنے قارئین سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اس مسئلے کو ایک بالکل مختلف تناظر میں دیکھیں۔ مختصراً وہ ایک ہلاکت گریز سماج کے امکانات کے حوالے سے اس امر کا تقاضہ کرتے ہیں کہ ماضی اور مستقبل کو ازسرِ نو دیکھا اور پرکھا جائے۔

گلین پیج کون ہیں؟

گلین ڈی پیج، یونی ورسٹی آف ہوائی میں علم سیاسیات کے شعبے میں پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ وہ 1994ء سے غیر منافع جاتی مرکز برائے عالمی عدم تشدد (CGNV) کے بانی اور صدر ہیں۔ وہ 1929 میں پروکٹان، میساچیوسٹس امریکہ میں پیدا ہوئے۔ انہون نے فلپس ایکسٹرا اکیڈمی (1947)، پرنسٹن یونی ورسٹی (AB سیاسیات 1955)، ہارورڈ یونی ورسٹی (ایم اے ریجنل اسٹڈیز، مشرقی ایشیاء 1957) اور نارتھ ویسٹرن یونی ورسٹی (پی ایچ ڈی، پولیٹیکل سائنس 1959) میں تعلیم حاصل کی۔ وہ کورین جنگ میں حصہ لے چکے ہیں جہاں انہوں نے امریکی فوج کے 10th AAA Group میں اینٹی ایرکرافٹ آرٹلری کمیونیکشن آفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ یہ گروپ ستمبر تا دسمبر 1950 کے دوران فرسٹ ROK انفنٹری ڈویژن کے ساتھ وابستہ تھا۔

پیج تدریس اور تحقیق کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے سیول نیشنل یونی ورسٹی کے گریجویٹ اسکول آف بزنس ایڈمنسٹریشن (1959-61)، پرنسٹن یونیورسٹی (1961-67) اور

یونیورسٹی آف ہوائی (92-1967) میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ وہ دی کورین ڈیسیشن (نیویارک: دی فری پریس 1968)، دی سائیٹینک اسٹڈی آف پولیٹیکل لیڈرشپ (نیویارک: دی فری پریس، 1977) اور نان وائیلنٹ پولیٹیکل سائنس: فرام سیزنس آف وائیلنس (ہونولولو: سینٹر فار گلوبل نان وائیلنس پلاننگ پروجیکٹ، اسپارک ایم میٹسونا گا انسی ٹیوٹ فار پیس، یونیورسٹی آف ہوائی، 1993) کے مصنف ہیں۔ پیج نے بالخصوص عدم تشدد اور ہلاکت گریزی کے موضوعات پر کئی تحقیقی مقالے بھی تصنیف کیے ہیں۔

سی جی این وی (CGNV) نے پیج اور ان کے خصوصی مطالعے ''ہلاکت گریز عالمی علمِ سیاسیات'' کے بارے میں جو خلاصہ جاری کیا ہے اس کے مطابق، ان کا یہ کام پچاس برس کے تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس تجربے کا آغاز ان کی کورین جنگ میں شمولیت سے ہوا تھا۔ 1973 اور 1974 کے بعد، چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے پر محیط دریافت اور دوبارہ تعلیمی تجربے کے عمل سے گزر کر علمِ سیاسیات کے اس ماہر کی قلب ماہیت ہوئی اور تشدد کو قبول کرنے والا یہ استاد، ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کے ماہر میں تبدیل ہوا۔ یہ ایک عظیم قلب ماہیت تھی کیونکہ ایک طالب علم اور استاد کے ادوار میں ان کے کیریئر اور فکر کی جو تشکیل ہوئی تھی اس کے مطابق وہ علمِ سیاسیات سے ایک روایتی ماہر تھے جن کے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں، کوریا اور دوسرے علاقوں میں جنگ اور جنگ کے آثار اور خطرات کی تائید اور حمایت کی گئی تھی۔

تاہم، امن اور آزادی کے لیے ایک جنگ میں حصہ لینے کے بعد، وہ 1970ء کی دہائی میں، امریکہ کی حمایت یافتہ جنوبی کوریا کی فوجی حکومت کی جابرانہ طرز حکمرانی اور جمہوری سیاسی رہنما کم رائی جنگ اور عدم تشدد پر یقین رکھنے والے کیتھولک شاعر کم چی ہا کو درپیش موت کی سزا کے خطرے سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ یونیورسٹی آف ہوائی کی جانب سے پرامن ثقافتی تبادلے کے پروگرام کے تحت شمالی کوریا کے دانش وروں کو ہونولولو کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ امریکہ اور جنوبی کوریا کی حکومتوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس واقعہ نے بھی پیج کو بہت زیادہ پریشان اور بے آرام کیا۔ حقائق اور اقدار کے درمیان اس تصادم (جسے سماجی نفسیات میں Cognitive Dissonancc کہا جاتا ہے) کے دوران ایک دن اچانک برقی توانائی کی طرح کا ایک کوندا ان کے پنجوں سے اوپر لپکا اور پورے بدن سے گزرتا ہوا ان کے دماغ تک پہنچ

گیا جہاں تین خاموش لفظ بول اٹھے "اب مزید قتل نہیں" (No more Killing)۔ یہاں سے ان کی سوچ اور فکر میں گہری تبدیلی کا عمل شروع ہوا۔ انہوں نے علم سیاسیات کے نظام اقدار پر سوال اٹھانے شروع کئے اور اس کے بعد حقیقت پسندانہ ہلاکت گریز متبادلات کی تلاش میں وہ علمی جستجو کی نئی راہوں پر نکل گئے۔ اس ضمن میں پیج کا پہلا قدم یہ تھا کہ انہوں نے اپنی کتاب The Korean Decision پر ایک تنقیدی تبصرہ تحریر کیا جس میں امریکہ اور اقوام متحدہ کی جنگ میں شمولیت کی حمایت کی گئی تھی۔ اپنی کتاب پر خود مصنف کا لکھا ہوا یہ تنقیدی جائزہ امریکن پولیٹیکل سائنس ریویو جلد 71، نمبر 4 (دسمبر 1977) میں "On Values and Science: The Korean Decision Reconsidered" عنوان سے شائع ہوا۔

جنگ سے امن، عدم تشدد سے ہلاکت گریزی کا سفر پیج کو کئی ملکوں میں لے گیا۔ ان ملکوں میں ہندوستان، جنوبی امریکہ اور روس شامل تھے جہاں انہوں نے عدم تشدد کے حوالے سے گاندھی، جین، کنگ اور ٹالسٹائی کے نظریات اور روایات کا مطالعہ کیا۔ وہ 1983ء میں بون گئے جہاں انہوں نے جرمنی کی عدم تشدد کی تنظیم Die Grunen (گرین پارٹی) کی بانی پیٹرا کے کیلی سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ عدم تشدد کے موضوع پر طویل مباحثے کئے۔ 1981ء میں، انہوں نے اقوام متحدہ یونیورسٹی ٹوکیو کے تعاون سے بالی میں "اسلام اور عدم تشدد" کے موضوع پر ایک تحقیقی سیمنار کا انعقاد کیا۔ بعدازاں وہ دوسری کئی جگہ گئے جہاں تحقیقی ادارے اور گروپ عدم تشدد کے موضوع پر کام میں مصروف تھے۔ اس طرح، بتدریج ان کے ذہن میں ہلاکت گریز عالمی سماج کے بارے میں تصورات ایک واضح اور مربوط شکل اختیار کرتے گئے۔ بالآخر ان کے مطالعے کا جوہر ایک کتاب کی صورت میں سامنے آیا۔ اس کتاب کا عنوان "ہلاکت گریز علم سیاسیات" (Non Killing Political Sceince) تھا جسے CGCV نے 2002 میں شائع کیا۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں امریکہ، ہندوستان اور فلپائن میں شائع ہوئی۔ 2004 تک اس کتاب کا ترجمہ 18 زبانوں میں ہو چکا تھا۔ (17) دنیا کے بہت سے نمائندہ اور نمایاں علم سیاسیات کے ماہرین، امن اور عدم تشدد کے اسکالر اس کتاب کی حمایت میں اپنی رائے دے چکے ہیں۔

پیج نے اس کتاب میں جو مطالعہ پیش کیا ہے وہ پڑھنے میں آسان، قائل کر دینے والا اور بہت پر اثر ہے۔ اول یہ کہ، Democide، Ethnicide اور Politicide پر کئی دوسروں

مطالعوں کے برعکس یہ کام محض انسانی ہلاکتوں کے اعداد و شمار کا مجموعہ نہیں ہے۔ نہ یہ طویل عرصے سے جاری اس انسانی روایت کے بارے میں ایک طرح کا معذرت نامہ ہے۔ اس کی بجائے پیچ نے پرزور انداز میں یہ موقف پیش کیا ہے کہ عمومی طور سے زیادہ تر سماج خوں ریزی کے خوف ناک ادوار میں بھی ہلاکت گریز رہے ہیں اور دنیا کی غیر معمولی آبادی قتل نہ کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ درحقیقت، یہ کام اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ ایک ناگریز عالمی سماج تقریباً موجود ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اس کی جانب توجہ دیں، اس کی موجودگی کو محسوس کریں اور اس کے وجود کو تسلیم کریں۔ دوم یہ کہ یہ کتاب بڑے موثر انداز میں یہ دلالت کرتی ہے کہ علم سیاسیات کے نصاب میں موجود مواد میں تشدد کی قبولیت کافی زیادہ ہے اور وہ ظاہری یا باطنی طور پر اسے جائز قرار دیتا اور فروغ دیتا ہے۔ اس نصاب کے مواد کو زیادہ وسعت دینی چاہئے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ علمِ سیاسیات کے شعبے میں اس، عدم تشدد اور ہلاکت گریزی کو تدریس اور تحقیق کے حوالے سے زیادہ جگہ اور نمایاں مقام دیا جائے۔ اس کتاب میں تیسرا اور نہایت اہم نکتہ یہ اٹھایا گیا ہے کہ ہلاکت گریز عالمی سماج کا قیام اس وقت ممکن ہوگا کہ جب طاقت پر توجہ مرکوز کرنے اور طاقت کو محور بنانے والے علمِ سیاسیات کو ایک ہلاکت گریز علمِ سیاسیات میں منقلب کر دیا جائے۔ اختصار سے یہ کہا جانا چاہئے کہ پیچ ایک دانش ورانہ انقلاب کی وکالت کرتے ہیں جو ایک پُرامن سیاسی انقلاب کے ذریعے ہلاکت گریز عالمی سماج قائم کرنے کی راہ ہموار کرے گا۔

پیچ کا ہلاکت گریز عالمی سماج

یہاں سوال یہ ابھرتا ہے کہ پیچ کا ہلاکت گریز سماج کیا اور کیسا ہوگا؟ اس کے تصور کے مطابق "ایک انسانی کمیونٹی، سب سے چھوٹی سے لے کر سب سے بڑی، علاقائی سے عالمگیر، جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انسان نہ ہلاک کیے جائیں اور نہ انہیں ہلاک کرنے کی دھمکیاں دی جائیں، جہاں انسانوں کو ہلاک کرنے کے لیے کوئی ہتھیار نہیں بنایا جائے اور نہ ان کے استعمال کو جائز قرار دیا جائے، اور جہاں نظم و نسق برقرار رکھنے یا تبدیلی کے لیے سماج کسی نوعیت کی دھمکی یا ہلاک کرنے والی قوت کے استعمال پر انحصار نہیں کرے گا۔(18)" یہ کیسا سماج ہوگا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے پیچ کہتے ہیں، جہاں "مذاہب ہلاکت آفرینی کی اجازت نہیں دیتے،

ہلاک کرنے کے لیے آسمانی احکامات نہیں دیے گئے۔حکومتیں اسے جائز قرار نہیں دیتیں، حب الوطنی کو اس کی ضرورت نہیں، انقلابی اس کا حکم نہیں دیتے۔ دانشور اس کے لیے عذر پیش نہیں کرتے، فنکار اس پر جشن نہیں مناتے، عوامی دانائی اسے دوام نہیں بخشتی، عقلِ سلیم اسے اچھا نہیں گردانتی۔عہدِ حاضر میں کمپیوٹر کی اصلاح کے مطابق ایک ایسا سماج قتل کرنے کے لیے نہ ''ہارڈ ویئر'' فراہم کرتا ہے اور نہ ''سافٹ ویئر''۔(19)

پیچ کے ہلاکت گریز سماج کے بارے میں یہ غلط رائے قائم نہیں کرنی چاہئے کہ یہ ایک بے حس وحرکت، اطاعت گزار اور غیر فعال سماج ہوگا۔اس کے برعکس یہ حرکی، فعال، مسئلے کو حل اور امن کو قائم کرنے والا سماج ہوگا۔اس کے نمایاں خدوخال پر بحث کرتے ہوئے پیچ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ ہلاکت گریزی لاتعلقی یا بے عملی کا نام نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں۔

''مثال کے طور پر، جین مت کا اہنسا کا فلسفہ جانوروں، پرندوں اور دیگر نوع کی حیات بچانے کی کوشش کرتا ہے (ٹوبیاس 1991ء)۔ ہلاکت گریزی کی کوشش کس طرح نمایاں ساختیاتی تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔اس کی جھلک ہندوستان میں گاندھی کی تحریک میں دیکھی جاسکتی ہے۔اس تحریک کی نظر نہ صرف سیاسی آزادی پر بلکہ نمایاں معاشی، سماجی، اور ثقافتی تبدیلیوں پر تھی جو غریبوں، عورتوں، اقلیتوں، ذات پات، اور باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوسکیں''۔(20)

تاہم ایسے سماج کی کتنی ہی خواہش کی جائے اس کا قیام بظاہر ایک ناممکن العمل محسوس ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے سماج کا تصور ہے جسے سرکش انسانی تخیل تک اپنی گرفت میں لانے کا متحمل نہ ہو۔پیچ کا خیال ہے کہ اس نوعیت کی تعبیریں قابل فہم ہیں کیونکہ عصری سیاسی علم کی جڑیں ان سیاسی مفکرین کی تعلیمات میں پیوست ہیں جنہوں نے بلایا بالواسطہ طور پر، سفاک بادشاہوں کے سیاسی اور مادی مفادات کے لیے یا تو طاقت کے بہیمانہ استعمال اور انسانوں کی ہلاکت خیزی کو جائز قرار دیا ہے یا طاقت کے ناگزیر غلط استعمال پر صرف نوحہ کیا ہے۔تشدد کی مندانہ فتح روایت کے نشے میں چور، علاقائی ریاستوں، بالخصوص امریکہ نے علاقائی وسعت، قومی انضمام اور خود اپنے اور دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل کیا ہے۔مختصر یہ کہ بادشاہ کی دنیا میں جہاں طاقت کی سربلندی اور حکومت ہوتی ہے وہاں سیاسی طور پر ہلاکت گریزی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

تناظر لیکن اگر تبدیل ہوجائے اور مرکز نگاہ بدل جائے تو ایک دوسری حقیقت کا پیکر ابھرنے لگتا ہے پھر ایک ہلاکت گریز عالمی سماج کا تصور قابل حصول نظر آنے لگتا ہے۔اس مرحلے پر، پیج ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نوعیت کے سماج ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور انتہائی خوں ریز ادوار میں بھی انہوں نے اپنا وجود برقرار رکھا ہے۔ وہ اس نکتے پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ انسانوں کی اکثریت قتل نہیں کرتی۔وہ تمام انسان جو آج زندہ ہیں اور جو ماضی میں زندہ تھے ان میں صرف اقلیت قاتلوں کی تھی۔ایک بار اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ عورتیں قتل کر سکتی ہیں اور کچھ عورتوں نے جنگوں اور انقلابوں میں حصہ لیا تھا اور چند سماجوں میں عورتوں کے ساتھ بچوں نے بھی فوجی مہموں میں حصہ لیا تھا، تو اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ عورتوں کی غالب اکثریت جنگجو اور فوجی قاتل نہیں تھی۔ بنی نوع انسان کی کل تعداد کا نصف عورتوں پر مشتمل ہے۔مردوں کی اکثریت بھی قاتل نہیں ہے۔ان کی اقلیت جنگوں میں لڑتی اور قتل کرتی ہے۔ان میں سے بہت نہ چاہتے ہوئے قتل کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد وہ زندگی بھر اس کے اثرات اور اذیت میں مبتلا رہتے ہیں، خود کو، اپنے خاندان اور کمیونٹی کو متاثر کرتے ہیں یا پھر ندامت، پشیمانی اور ضمیر کی ملامت میں مبتلا رہتے ہیں۔

پیج ، وٹوق سے مزید کہتے ہیں کہ ذات ، عقیدے، زبان، ثقافت اور جغرافیائی شناخت سے قطع نظر خاندان کے ارکان میں محبت کا جذبہ عالمگیر ہوتا ہے۔وہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کرتے ۔پیج اس جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسانی خاندان میں ہلاکت گریزی کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ان کا مزید کہنا ہے ''اگر بنی نوع انسان فطری طور پر قاتل ہوتے، اگر صرف نصف انسانیت ناگزیر طور پر قاتلانہ رجحان کی حامل ہوتی، تو اپنی مختلف شکلوں میں خاندان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا تھا۔باپ ماؤں کو قتل کر ڈالتے ، مائیں باپوں کو؛ والدین بچوں کو؛ اور بچے والدین کو۔ایسے واقعات ہوتے تو ہیں لیکن ان واقعات کی بناء پر ہلاکت آفرینی کا ایک ایسا فطری قانون قائم نہیں ہوتا جو نوع انسانی کی تقدیر کے فیصلے کر سکے۔اگر ایسا ہوتا تو بہت عرصہ پہلے دنیا کی آبادی عدم آبادکاری کر چکی ہوتی''۔(21)

درحقیقت ایک سامنے کی حقیقت کو نظر انداز کرنے کا رویہ انسان کی فطرت میں موجود ہے۔جب سامنے کی کسی حقیقت کی جانب اس کی توجہ دلائی جائے تو وہ بڑے حیرت اور استعجاب

سے کہتا ہے "واقعی، یہ مظہر موجود ہے۔ میں اب تک اسے کیوں نہیں دیکھ سکا تھا۔ یہ تو سامنے کا سچ ہے، میں نے اسے نظر انداز کیسے کیا؟" انسانی سماج میں ہلاکت گریزی کا مظہر ایک کھلی حقیقت ہے لیکن روایتی علمِ سیاسیات اس کا ادراک کرنے میں ناکام رہی ہے۔ جیسا کہ علم البشریات کے ماہر لیلے ای اسپانسل کہتا ہے:

"غیر متشدد اور امن پسند سماج خال خال نظر آتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ درحقیقت، ناپید یا نہ ہونے کے برابر ہیں بلکہ اس لیے کہ تحقیق، ذرائع ابلاغ اور دوسرے شعبوں میں عدم تشدد اور امن بہت ناکافی طور پر زیرِ غور لائے جاتے ہیں۔" وہ مزید کہتا ہے، "عدم تشدد اور امن کی خصوصیات، کیفیات، وجوہ، فریضوں، ارتقائی مراحل، اور اثرات جاننا اتنا ہی ضروری ہے جتنا تشدد اور جنگ کے معاملات کا جاننا۔" (22)

اپنے نظریے کی حمایت میں پیج جے۔ ایم۔ جی وان ڈر ڈینِنن کے غیر معمولی مطالعے کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ابتدائی دور کے انسانوں میں عالمگیر ہلاکت آفرینی کے بارے میں ہابس کے تصور پر منطقی سوالات اٹھائے گئے تھے۔ گذشتہ صدی تک، ۲ تھنوگرافک لٹریچر میں پچاس ہزار "قدیمی" لوگوں میں جنگ اور باہمی دشمنی کے واقعات کا جائزہ لینے کے بعد وان ڈر ڈینِنن صرف 2000 ایسے گروہوں کو تلاش کر سکا۔ اس کے مطابق دیگر گروہوں میں جنگ اور لڑائی کی شہادت کی عدم موجودگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لوگ پُر امن تھے، وان ڈر ڈینِنن عالمگیر انسانی جنگجوئی کے مفروضوں کو ایک عقیدے کی طرح قبول کرنے کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ (23) وہ قدیموں سے زونی تک 395 "انتہائی غیر جنگجو" لوگوں کی ۲ تھنوگرافک شہادت بھی پیش کرتا ہے۔ (24)

مذہبی اور سیکولر افکار میں ہلاکت گریز جوہر، عدم تشدد کی تحریکوں بشمول بموں پر پابندی، تمام جنگوں کے خاتمے، عورتوں اور بچوں کے حقوق کے فروغ، تعلیم کے پھیلاؤ، تنازعات کے پر امن ذرائع سے حل اور عالمی عالمگیر قدروں کے حصول کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنے والی تحریکوں کا حوالہ دیتے ہوئے پیج علمِ سیاسیات کے شعبے میں ہلاکت گریز صفاتی تبدیلی کا تقاضہ کرتے ہیں۔ وہ ناگریز ہلاکت آفریں کے مفروضے کو ناگزیر اور ناقابلِ تبدیل ہلاکت گریزی کے تصور میں تبدیلی کرنے پر زور دیتے ہیں۔

پیج کے مطابق، ہلاکت گریز سماج کے حصول کے لیے ہلاکت گریز تخلیقیت کی جانب شعبہ جاتی تبدیلی ضروری ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اس کے حصول کی خاطر عدم تشدد پر مبنی ایک سائنسی انقلاب کی ضرورت ہے۔ان کے مطابق یہ انقلاب اس وقت ممکن ہوگا جب سات ذیلی انقلابات کو عمل کی راہ پر ڈال دیا جائے۔یہ انقلاب ہیں:

"ہلاکت کو تسلیم کرنے سے لے کر اس کو مسترد کرنے تک ایک معیاری انقلاب: ہلاکت گریز سماجی تبدیلی کے لیے سازگار عناصر کی شناخت کرنے کے لیے حقیقت پر مبنی انقلاب؛ ہلاکت گریز تبدیلی کی وجوہ اور طریق عمل سے آگہی کے لیے ایک نظریاتی انقلاب؛ ہلاکت گریزی کی قلب ماہیت کے لیے آگہی اور مہارتیں فراہم کرنے کے لیے ایک تعلیمی اور تربیتی انقلاب؛ عمل میں ہلاکت گریز آگہی کو شامل کرنے کے لیے اطلاقی انقلاب؛ ہلاکت گریز تبدیلی میں آسانی پیدا کرنے کے لیے تنظیموں کی قلب ماہیت اور تخلیق کے لیے ایک ادارہ جاتی انقلاب؛ اور ہلاکت گریز قلب ماہیت کے مقاصد کے لیے انتہائی سازگار تحقیق، تجزیے اور عمل کے طریقے تخلیق کرنے اور مطابقت پذیر بنانے کے لیے طریقیاتی انقلاب۔"(25)

پیج یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ انسانی ہلاکت آفرینی کے عہد کو ختم کرنا صرف علمِ سیاسیات کی تنہا ذمہ داری نہیں ہے۔اس کے لیے سائنس اور علمِ مدنیات کے تمام شعبوں اور دیگر پیشوں کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔اس کے لیے ہر ایک کی ضرورت ہوگی۔پیج کا کہنا ہے کہ علمِ سیاسیات یقینی طور پر اس عمل میں سبقت لے کر پرامن سیاسی قیادت اور جماعتوں کے فروغ میں مدد فراہم کرسکتا ہے۔ان کا کہنا ہے:

"سیاسی قیادت اور ہلاکت آفرینی کے مسئلے کی ایک مثال ہٹلر اور عالمگیر تباہی ہے لیکن یہ مظہر صرف اس مثال تک محدود نہیں ہے۔اس مسئلے کا براہ راست مقابلہ کرنا ہوگا اور اطلاقی سائنس کے ذریعے مسائل کے حل کی خاطر بنیادی اور پائیدار کوششیں عمل میں لانی ہوں گی۔نسل کشی ،جارحیت، بڑے پیمانے پر طبقاتی بیخ کنی اور شہری بربادی کی ہولناک مثالوں کو ہلاکت گریز

سائنسی تخلیقیت کو مفلوج کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔ بصورت دیگر، ظاہری یا باطنی طور پر علم سیاسیات اس خونریزی اور سفاکی کا مقابلہ کرنے میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو جائے گی جو اس نسل کش آمر، انقلابی طبقے کے تباہ کار یا شہروں اور دیہاتوں کو تقدس کے نام پر تباہ کرنے والوں کے تشدد کے مقابلے میں کہیں بڑی ہوگی" (26)

اس لیے، پیچ علم سیاسیات اور تشدد کو قبول کرنے والے دیگر شعبوں کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں اور ان کے اثرات کی بات کرتے ہیں۔ دیگر عقیدوں اور پیشوں کے ساتھ ساتھ، علم سیاسیات کو ماضی کے غیر متشدد تجربات کا احاطہ کرنا چاہیے، موجودہ غیر متشدد صلاحیتوں کو تسلیم کرنا چاہیے، مستقبل کے لیے غیر متشدد امکانات پر روشنی ڈالنا چاہیے، اور تحقیق، تدریس، اور ہلاکت گریز سماجی تبدیلی کے لیے سرکاری خدمات میں اس بصیرت کو آگے بڑھانے میں تعاون کرنا چاہیے۔ (27)

اپنے مقالے کے اختتام پر، پیچ ہلاکت گریز علمِ سیاسیات میں عالمی فکر کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ انتہائی واضح بے لاگ اور دل نشیں انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہلاکت گریز علم سیاسیات کا دائرہ عالم گیر ہونا چاہیے۔ اسے دریافت، اختراع، تنوع اور اثر پذیری کے اعتبار سے، جذبے، سائنس، مہارتوں، گیت، اداری ترجمانیوں، اور اختصاصِ وسائل کے اعتبار سے، پُر مسرت زندگی کے لیے درکار پہل کاریوں کے لیے خلاق قیادت کے نشو ونما اور سب کو بااختیار بنانے کے حوالے سے اُسے عالم گیر ہونا چاہئے۔ علمِ سیاسیات کو انسانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمدردانہ وابستگی کے حوالے سے عالم گیر ہونا چاہئے۔ اُسے ہر جگہ سے قتل کے خاتمے کے عزم کے حوالے سے عالم گیر ہونا چاہئے، بصورت دیگر کوئی فرد کہیں بھی محفوظ نہ ہوگا۔ اُسے شراکت کے اعتبار سے عالم گیر ہونا چاہئے کیونکہ کوئی ایک مسلک، پیشہ، یا سماج تمام مطلوبہ بصیرتیں، مہارتیں اور وسائل نہیں رکھتا۔ اُسے مقامی سطحوں پر فلاح سے وابستگی کے اعتبار سے عالم گیر ہونا چاہئے کیونکہ یہ وہ چھوٹے بیج ہیں جو عالم گیر آزادی کے خواب کے لیے

بارآور ہو سکتے ہیں۔اسے تنوع کے احترام میں اور خود اپنے اور دوسرے سماجوں میں لوگوں کی ہلاکت گریز فلاح سے، کثیر الجہت وفاداریوں کے حوالے سے عالمگیر ہونا چاہئے، اُسے اُن سب لوگوں کے درمیان باہمی تعاون (Supportiveness) کے حوالے سے عالم گیر ہونا چاہئے جو مکمل آزادی، برابری، خوشحالی اور امن کے حصول کی راہ میں مزاحم ہلاکت آفریں دور کے خاتمے کے لیے مطالعے، تدریس اور عمل میں مصروف ہیں۔ہمیں عالم گیر ہونا چاہئے کہ ہم چاند سے اپنی مادر گیتی کا نظارہ کر سکیں جہاں ہم سب زندگی کی اربوں لحاتی چنگاریوں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔لیکن ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ ہلاکت گریز دنیا کی تعمیر میں ہم سب کو اہم کردار ادا کرنا ہے۔ہم میں سے کوئی ایک بھی اس حوالے سے غیر اہم نہیں ہے۔"

پیج کے مقالے پر تبصرے (29)

اس کتاب میں ہلاکت گریزی کا جو تصور اور خیال پیش کیا گیا اس کی جانب نہ صرف متعلقہ شعبے بالخصوص علمی حلقے بلکہ سیاسی شخصیات بھی تیزی سے متوجہ ہو رہی ہیں۔ان میں ہندوستان کے سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال بھی شامل ہیں۔انہوں نے 3 فروری 2004 کو نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں اس کتاب کے انگریزی اور تامل ایڈیشنوں کے اجرا کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "اس کتاب کو علمِ سیاسیات کے ہر شعبے میں پڑھا جانا چاہئے۔عام لوگوں کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔"

خوں ریزی کے اس دور میں علمِ سیاسیات کے بہت سے نمایاں ماہرین اور امن کے اسکالروں نے اس کتاب کی اشاعت کو بہت بروقت قرار دیا ہے۔اسے جوہاں گال ٹنگ نے "منفرد" "انسانیت کے لیے ہزاری کا مثالی تحفہ" نوبل انعام یافتہ مائرید میگوائر نے "انتہائی فکر انگیز اور پراثر" آن چنگ۔سی نے اسے علمِ سیاسیات میں صفاتی تبدیلی کے حق میں ایک طاقت ور مقدمہ، ٹی۔کے۔این نے "عالمی ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کے قیام کے حق میں ایک شاندار

موقف کا اظہار" اور این رادھا کرشنن نے اسے ایک "سنگ میل اشاعت" قرار دیا ہے۔ امن اور عدم تشدد کے ایک ممتاز اسکالر، مائیکل ٹرو نے اس کتاب پر ان الفاظ میں اظہار رائے کیا ہے:

"ہلاکت گریز علمِ سیاسیات" نے اس علمی شعبے میں مطالعے کی نئی جہت متعارف کرائی ہے۔ عام لوگوں اور سماجی سائنس کے ماہرین کے لیے اس کتاب میں ایک واضح اور جامع مواد موجود ہے۔ جینی شارپ کے کلاسک مطالعے The Polities of Nonviolent Action (1973) سے پہلے اسکالر نے 'سماج کس طرح کام کرتا ہے' کے موضوع پر روایتی طور سے اتنا معلوماتی لیکن تخلیقی اور طبع زاد مقالہ پیش کیا ہے جس میں افلاطون اور ارسطو سے لے کر میکاولی اور ویبر تک کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس نکتے کو بھی اٹھا گیا ہے کہ "سماج کو کس طرح بہتر انداز میں کام کرنا چاہئے"۔ امن اور تنازعات کے مطالعوں میں اس کتاب کا مطالعہ لازمی قرار پائے گا اور پولیٹیکل تھیوری اور حکمت عملی کے کورس کے لیے یہ ایک ناگزیر حوالہ بن جائے گی"۔(30)

امن اور عدم تشدد کے ایک اور اسکالر اور سری لنکا میں عدم تشدد کی طاقت ور تحریک سرودیا شرمادھنا موومنٹ کے رہنما اے۔ ٹی آریارتنے کی رائے ہے: "میں نے ہلاکت گریزی کی حمایت میں اتنا طاقت ور اور مکمل مواد اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھا ہے" ان کا مزید کہنا ہے "یہ کتاب پوری دنیا میں علمِ سیاسیات کے شعبے کے سامنے یہ چیلنج پیش کرتی ہے کہ وہ آگے بڑھے اور ایسے سماج کی تعمیر میں شریک ہو جہاں نہ کوئی قتل اور نہ قتل کا کوئی خطرہ ہو"۔(31)

ہلاکت گریزی پر پروفیسر پیج کا یہ مطالعہ، ہونولولو، ہوائی سے 2002 میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں ممتاز ماہر علم سیاسیات جیمز اے۔ رابنسن کا ایک غیر معمولی تعارف بھی شامل ہے۔ اس کتاب کے مرکزی خیال کو اجاگر کرتے ہوئے تعارف میں کہا گیا ہے:

"آپ کے ہاتھ میں جو کتاب ہے اسے مصلح اور معلم کہنا چاہئے۔ جب اسے وسیع پیمانے پر پڑھا جائے گا اور سنجیدگی اختیار کی جائے گی تو یہ عالمی طور پر موجود بعض اقدار کو اور ان اقدار کی تشکیل کرنے والے اداروں کی بنیادیں ہلا دے گی۔ ان اقدار، اہداف، ترجیحات، مطلوبہ نتائج، واقعات اور فرمان نیز متعلقہ اداروں میں وہ شامل ہیں جن کا تعلق طاقت کے

حصول اور استعمال سے ہے۔"(32)

اس مطالعے میں موجود نئے اور پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے اس تعارف میں مزید کہا گیا ہے:

"ارتقائی عمل کے فروغ کا جھکاؤ، ہلاکت گریزی کے حق میں رکھنے کا حتمی دارومدار صرف عزم اور وابستگی اور رائے عامہ کی ساکھ پر منحصر نہیں ہے۔ ان کے لیے معلومات کی ایسی بنیادوں کے حصول کی ضرورت ہے جن کے ذریعے عمل کے متبادل راستے اور طریقے تیار اور نافذ کیے جا سکیں اور ان کی تخمیہ کاری ہو سکے۔ اس پس منظر میں، ایک ہلاکت گریز علم سیاسیات کی بے پناہ اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"(33)

سرسری طور پر یہاں دیے جانے والے ان حوالوں سے یہ موقف واضح انداز میں سامنے آتا ہے کہ ہلاکت گریزی کے موضوع پر پیچ کے اس پہلے کارِ مطالعے کو بالخصوص عدم تشدد کے پرچارکاروں اور اسکالروں کی طرف سے بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں علمی حلقے اس پر مباحثہ کر رہے ہیں اور یہ کتاب لوگوں میں بے پناہ دل چسپی پیدا کر رہی ہے۔ علم کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے ہلاکت کے بحران کے دور میں، پیچ کا یہ مطالعہ قتل اور خوں ریزی کے خطرے اور خوف سے دوچار دنیا کے شہریوں کے لیے امید کا ایک پیغام ہے۔

Footnotes

1) Glenn D. Paige, Nonkilling Global Political Science, Philadelphia : X Libris Corporation, 2002.
2) http://www.motivateus.com/thou-26. htm - accessed on 22 November, 2004.
3) Quoted in "Introduction: paradigms of Crisis and Crisis of paradigms", IDRC Reports: An Online Magazine documento (s) 3 de 4, 10 September 1999, http://web.idrc.ca/es/ev.25568-201-1-DD Topic html - accessed on 22 November, 2004.
4) Robert Kaplan, "The Coming Anarchy", Atlantic Monthly, quoted in ibid.
5) Charles W. Kegley, Jr. & Eugene R. Wittkopf, World politics: Trend and Transformation, Boston: Bedford / St. Martin's, 2001. P.437.
6) See A. Stiglmayer (ed), Mass Rape: The war against women in Bosnia - Herzegovina, Lincoln: University of Nebraska Press, 1994.
7) Allen D. Grimshaw, "Genocide and Democide" in Lester Kurtz et al (eds.), Violence, Peace, Conflict, 3 vols., vol 2, Boston: Academic press, 1999, P.61.
8) Ibid.
9) Ibid.
10) Ruth Leger Sivard, World Military and social

Expenditures 1985, Washington, D.C.: World Priorities, 1985, P.9.

11) Hal Kane, The Hour of Departure: Forces That Create Refugees and Migrants, Washington, D.C.: World Watch Institute, 1995, P.19, quoted in Charles W. Kegley, Jr. and Eugene R. Wittkopf, op .cit, P.410.

12) Richard A. Falk and Samuel S. Kim, "General Introduction" in Richard A. Falk and Samuel S, Kim (eds.), The War System: An Interdisciplinary Approach, Westview special studies in Peace, Conflict, and Conflict Resolution, Boulder, Colorado: Westview press, 1980, P.1.

13) Time (New York), 15 October 1990, P.58.

14) See Syed Sikander Mehdi, "Wars and War Victims", Pakistan Horizon, vol. 44, No.1, January 1991, pp.63-77.

15) These are far too many to be listed here. Peace and nonviolence scholars from the west in particular have produced a number of pioneering, path - breaking and highly innovative studies. These have paved the way for global movements for human security, humane and democratic governance, human rights, women's and children's rights, human development and human happiness.

16) The proceedings of the seminar were later published in book form. See.

17) Information obtained from cgnv, November 2004.

18) Glenn D. Paige, Nonkilling Global Political Science, P.1.

19) Ibid, P.2

20) Ibid, P.58

21) Ibid, P.26

22) Leslie E. Sponsel, "The mutual relevance of anthropology and peace studies" in Leslie E Sponsel and Thomas Gregor (eds.), 1997, PP. 11-19 quoted in Ibid, P.37.

23) J.M.G. van der Dennen, "Primitive war and the ethnological inventory project" in J.M.G. van der Dennen and V. Falger (eds.), Sociology and Conflict, London: Chapman and Hall, PP.257, 259, 264-9, referred to in Ibid, P.37-38.

24) J.M.G. van der Dennen, The Origins of War, 2 vols, Groningen: Origin press, 1995, PP. 595 - 619, referred to in Ibid, P.38.

25) Ibid, P.79. For details, see P.79 - 89.

26) Ibid, PP.101 - 102.

27) Ibid, P. 149.

28) Ibid, Pp. 161 - 162.

29) Taken from "Nonkilling Global Political Science: Reader Comments", mimeograph, released by the Centre for Global Nonviolence, undated.

30) Ibid.

31) Ibid.

32) James A. Robison, "Introduction: The Policy Sciences of Nonkilling" in Glenn D. Paige, Nonkilling Global Political Science, P. XIX.

33) Ibid, P. XXVI.

❁❁❁❁❁